پینتیسواں سفر ۔ واپس پاکستان اور پھر لندن

ہم ستمبر ۱۹۹۴ء میں سنگاپور ایئر لائنز سے پاکستان روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ہم خاصے فکرمند رہے۔ سارے راستے اپنی بیٹی رعنا کے بارے میں سوچتے رہے۔ راستے میں ایک صاحب بنام زوہیب ملے اور ان سے بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ ان کی بیگم کی طبیعت بھی بہت خراب تھی کہ کینسر ہو گیا تھا۔ بس سارے راستے بیماریوں اور تیمارداریوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس مرتبہ سنگاپور ایئرپورٹ پر کوئی خریداری کا بھی کوئی ایسا دل نہیں چاہا۔ سنگاپور سے کراچی کی پرواز بھی اسی طرح گزری اور ہم کراچی پہنچ کر باوجود تھکن کے، ایئرپورٹ سے براہِ راست آغا خان ہسپتال پہنچے۔ رعنا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب نظر آئی۔ یہ الائیڈ بنک میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھیں اور بنک کے تقریباً تمام لوگ ان کی مزاج پُرسی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ دوسرے ملنے جلنے والے بھی تھے اور ایک ہجوم سا تھا۔ وہیں پر تمام مذہبی عمل، دعائیں، اور ختمِ قرآن وہیں ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹروں نے ایک حفاظتی افسر تعینات کروا دیا کہ ملنے والے باری باری اندر جائیں۔ جب ہم دونوں ماں بیٹے وہاں پہنچے تو ہمیں بھی روکنے کی کوشش کی گئی، لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ ہمارا رشتہ کیا ہے تو ہمیں وہ خود اندر چھوڑنے آئے۔ فوراً ہم گلے ملے اور تسلیاں دیں۔ قریب رعنا کی ایک دوست بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں جس طرح خدانخواستہ کسی گزرے ہوئے کا پُرسہ دے رہی ہوں۔ ہم نے بیٹی کو چھوڑ کر اب اُن صاحبہ کو تسلی دینا شروع کی۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ یہ بیماریاں جو کراچی اور لاہور میں اب بڑھ رہی تھیں ان کا سہرا صرف اور صرف بسوں کے دھوئیں اور پانی کی گندگی پر ہے۔ غلیظ اور کم غذائیت کا کھانا اس سونے پر سہاگہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر طرف گٹر اُبل رہے ہوتے ہیں اور کوڑا اڑ رہا ہوتا ہے۔

یہاں ڈاکٹروں کا عجب انتظام لگا۔ ہر ڈاکٹر خود کو بادشاہ ظاہر کر رہا تھا۔ اتنا اچھا ہسپتال، لیکن ڈاکٹروں اور عملے کا بے زار روّیہ، خشک اندازِ گفتگو، اور ہر ایسی بات جس سے کہ مریض پر اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ ہم نے امریکہ کے چند سالوں میں دیکھ لیا تھا کہ ڈاکٹر اپنے مزاج اور روّیہ سے مریض کا آدھا مرض زائل کر سکتے ہیں، لیکن یہ بات ابھی تک پاکستانی ڈاکٹروں کے سمجھ میں نہیں آئی تھی اور ہر ڈاکٹر ''بابو صاحب'' بنا ہوا تھا۔ غرض ہماری بیٹی کی بیماری بڑھتی رہی اور پانچ ماہ گزر گئے۔ پھر یہ طے ہوا کہ انہیں علاج کے لئے لندن لے جایا جائے۔ اعجاز نے امریکہ کے یو سی ایس ایف ہسپتال اور اسٹنفورڈ ہسپتال سے بھی بات کی تھی، اور ایک ہسپتال میں رعنا کے علاج کا انتظام بھی کر رکھا تھا، لیکن پھر طے یہی ہوا کہ لندن کا ہسپتال زیادہ اچھا تھا گو کہ یہ ایک قدیم عمارت میں پرانی طرز کا ہسپتال تھا۔ دن رات فیکس مشینوں کے ذریعے رپورٹیں اِدھر سے اُدھر جاتی رہیں کہ اس زمانے میں الیکٹرانک میل یا ای میل عام نہیں تھی اور فیکس ہی واحد طریقہ تھا اس کام کے لئے۔

اب جو یہاں کے ڈاکٹروں کو پتہ چلا کہ ہم رعنا کو لندن لے جا رہے ہیں تو اُن کا روّیہ اور خراب ہو گیا۔ رعنا کا علاج اُن کے لئے آمدنی کا بڑا ذریعہ ہی نہیں، ان کی عزت کے لئے بھی اہم ہو گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر خورشید نے انتہائی غیر ذمّہ دارانہ انداز میں رعنا کی بیماری کے بارے میں غلط معلومات لندن کے ہسپتال بھیج دیں جس کا بعد میں لندن کے ڈاکٹروں نے خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ یہ کمر سے ہڈیوں کی مینگ کے ایک طبّی امتحان کے سلسلہ میں تھا۔ اس امتحان کے نتیجہ کے تحت، اور ڈاکٹر خورشید کے کہنے کے مطابق، رعنا کی بیماری ختم ہو رہی تھی۔ جب لندن پہنچتے ہی دوبارہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خورشید کی رائے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی تھی، اور یا لیبارٹری کی غلطی تھی۔ غرض ہم کو اب یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم نے سب سے عقلمندی کی بات یہ کی کہ آغا خان ہسپتال چھوڑ کر لندن کے رائل مارسڈن ہسپتال کا رُخ کیا۔

ہم ایمیریٹس ایئر لائنز سے ۲۶ر جنوری ۱۹۹۵ء کو لندن پہنچے۔ رعنا کو اسی دن ہسپتال لے کر گئے اور وہاں ان کے فوراً طرح طرح کے طبّی امتحان لئے گئے۔ ان کے علاج کا پہلے ہی مکمل منصوبہ بنا ہوا تھا اور اس ہسپتال کا خرچ رعنا کے الائیڈ بنک آف پاکستان نے کیا تھا گو کہ رہنے سہنے اور آنے جانے کی ذمہ داری پھر بھی رعنا اور ان کے شوہر کی تھی۔ ۵۵۰۰۰ر پاؤنڈ کا خرچ، اور پھر اس پر بھی صرف ۴۰ر فیصد کامیابی کا امکان بتایا تھا، یعنی کہ یہ ہسپتال بھی کوئی ذمّہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ اب یہ اللہ کی بنائی ہوئی مشین ایسی ہے کہ کوئی بھی اس

کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا تھا، لیکن فیس ہر حال میں پوری مانگتے ہیں۔ دوسری طرف یہی حضرات اپنی کار کی مرمّت کی گارنٹی پوری لیتے ہیں۔

لندن کے ایک نواح، سرے میں ہم نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا تھا جس میں تین کمرے تھے، لیکن غسلخانہ ایک تھا۔ پانی کے لئے گرم پانی کی ٹونٹی الگ اور ٹھنڈے پانی کی الگ۔ بڑا قدیم لگا یہ طریقہ جب کے سرے ایک اونچی آمدنی والوں کا رہائشی علاقہ تھا اور یہ بارہ منزلہ عمارت بھی دس سال سے زیادہ پرانی نہیں تھی۔ لیکن ویسے آسانیاں تھیں اور یہاں کا گھر گرم رکھنے کا انتظام بہت اچھا تھا۔ جنوری اور پھر فروری میں برف پڑی اور انتہائی سردی کی وجہ سے ہماری طبیعت بھی مضمحل رہی۔ یہاں ہم پانچ ماہ رکے۔ اس دوران ہمارے تمام بیٹے اور بیٹیاں اپنے بچوں کے ساتھ یہاں باری باری آئے، کچھ تیمارداری تو کچھ مزاج پرسی۔ اسی میں ہم رعنا کو لے کر تمام جگہیں دکھانے گئے۔ اس وقت لندن میں ہمارے خاندان کے تقریباً ۱۳/افراد تھے اور ہر جگہ ٹیکسی کی مشکل رہتی تھی کہ کم ازکم تین ٹیکسیاں کی جائیں، اور یہ کہ وہ سب ایک ساتھ ہی ملیں۔ ہمارے بیٹے شمس جب سان فرانسسکو سے یہاں آئے تو انہوں نے کار کرایہ پر لی تھی۔ ہر سڑک کسی زمانے میں پگڈنڈی اور گھوڑا گاڑی کا راستہ رہی تھی، لہذا لندن کا نقشہ بھی جلیبی کی طرح کا ہے۔ کبھی کہیں کا راستہ نہیں مل سکتا تھا۔ ہم ایک دن ایک رشتہ دار کے گھر جا رہے تھے کہ ایک جگہ کہیں راستہ پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ دیکھا کہ ایک جوڑا فٹ پاتھ پر جا رہا تھا تو سڑک کے کنارے کار روکی اور ان سے راستہ پوچھا۔ یہاں کے لوگ راستہ بتانے میں آگے آگے رہتے ہیں اور اس میں بہت مدد کرتے ہیں۔ اب مرد نے راستہ بتانا شروع کیا تو خاتون نے ان کی بات ٹوک کر ان کے بتائے ہوئے راستہ کے بارے میں تصحیح کرنے کی کوشش کی۔ اس پر وہ دونوں آپس میں زور زور سے گفتگو کرنے لگے، حتیٰ کہ یہ گفتگو تو تو میں میں کی صورت اختیار کر گئی۔ ہم حیران۔ شمس نے بھی جلدی سے اُن کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ افسوس ہوا کہ ہمیں راستہ بتانے کے سلسلے میں وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔

اس مرتبہ جب ہم مادام تساؤ کے میوزیم گئے تو یہاں ایک عجب صورت تھی۔ سب جانے والے ایک چھوٹی سی ریل گاڑی میں بیٹھ کر جاتے اور وہ ریل گاڑی ہر حصّہ میں سے ہوتی ہوئی تھوڑی دیر میں باہر۔ اگر آپ یہاں کچھ دیر رکنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں تھا۔ وقت کے ساتھ یہ بھی صرف اور صرف پیسہ کمانے کا دھندہ ہو

گیا تھا اور اس کا ثقافتی مقصد ختم ہو چکا تھا۔ لندن میں ہمارے اور رعنا کے شوہر اسد علی کے کئی رشتہ دار تھے جن کے آمد و رفت رہتی تھی۔ یہاں اتنی بڑی پاکستانی اور ہندوستانی آبادی ہے، بہت جاننے والے ملے، لیکن پاکستان یا امریکہ والا ماحول نہیں تھا۔ ہر وقت اندھیرا اور بارش۔ لوگوں کے چہروں پر بھی عجیب سی رنجیدگی یا سنجیدگی رہتی تھی اور باتوں میں امریکہ والی بے ساختگی نہ تھی۔

لندن ۱۹۹۵ء: دائیں طرف برٹش لائبریری کے سامنے.....اور.....بائیں طرف ٹاور آف لنڈن کے ساتھ، پیچھے ٹاور برج نظر آ رہا ہے۔

مارچ میں عیدالفطر پڑی اور یہ ہم نے یہیں گزاری۔ تمام رشتہ داروں سے ملاقات رہی اور اچھا ہنگامہ رہا، گو کہ رعنا کی طبیعت کی ناسازگی کا خیال ہر ایک کے ذہن میں تھا۔ اسی طرح پورے پانچ ماہ گزرے اور رعنا کا یہاں آپریشن کامیاب رہا۔ اس کے بعد ہم سب، یعنی ہمارے تیسرے بیٹے قمر کا خاندان اور چھوٹی بیٹی روبی سمیت، ۷ رمئی کو سان فرانسسکو آ گئے تا کہ رعنا کا باقی علاج یہاں امریکہ میں ہو۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ عیدالاضحیٰ جو کہ ۱۰ رمئی کو تھی، سب کے ساتھ کیلیفورنیا میں منائی جائے۔ اگرچہ لندن کا علاج اچھا تھا، لیکن وہاں اہم اشیاء کی بہت کمی تھی۔ اتنی بڑی رقم دینے کے بعد بھی اس ہسپتال میں ایکسرے کی اتنی مشینیں نہیں تھیں جتنی کے یہاں والنٹ کریک کے کائزر ہسپتال میں تھیں، اور ایم آر آئی تو اِکّا دُکّا ہسپتالوں میں ہوتا ہے، جب کہ

امریکہ میں اس کے بغیر کوئی ہسپتال، ہسپتال کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ رعنا کا بقیہ علاج یہیں کیلیفورنیا میں ہوا اور وہ اللہ کے فضل سے پوری طرح صحتمند ہوگئیں۔ اب ان کے یہاں آنے پر پھر وہی سیاحی دوڑ بھاگ۔ ان کے ساتھ بھی وہی بے ایریا، لاس انجلس، اور لیک ٹاہو کی دوڑ رہی جو ہم ہر آنے والے کے لئے نظم کرتے رہے تھے۔

سان فرانسسکو: لومبارڈ اسٹریٹ پر ہمارے سنجلے (تیسرے) بیٹے قمر اور تیسری بیٹی سلمٰی۔ دائیں طرف کی تصویر میں لومبارڈ اسٹریٹ کا چکراتا ہوا راستہ اور بائیں طرف اسی سڑک کا سیدھا، مگر بہت ڈھلان والا حصہ۔

کبھی نیویارک میں ایّام گزارے ہم نے
سان فرانسسکو میں ہر شام و سحر سے گزرے
ابھی ایل اے میں ہیں اور آگے سفر جاری ہے
ہر جگہ اُس کی بھی دیکھی اور اُدھر سے گزرے

سلطانہ آداؔ ۱۹۹۹ء